ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE: 2789-8784

# ZAUQ-E-TAHQEEQ

www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com

ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.6,Issue No.2(2024)
(April to June)

# اختر رضا سلیمی کے ناول "جندر" کا موضوعاتی مطالعہ

## Thematic Study of Akhtar Raza Salimi's Novel"Gender"

**ڈاکٹر صائمہ اقبال**

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

**ڈاکٹر روبینہ یاسمین**

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، سرحد یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، پشاور

**محمد شفیق**

اسکالر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

Dr. Saima Iqbal

Assistant Professor, Department of Urdu, GC University, Faisalabad

Dr. Rubina Yasmeen

Assistant Professor, Department of Urdu, Sarhad University of Science and Information Technology, Peshawar

Muhammad Shafiq

Scholar, Department of Urdu, GC University, Faisalabad

**Abstract:**

Akhtar Raza Salimi has a unique identity as a poet. Along with poetry, he has also spent his pen power in the field of novels, editing and criticism. Despite making his mark in poetry, he was not very satisfied with it. Therefore, he turned to prose and so far two of his novels have been published. The first "Jage Hain Khabam Mein" which was published in 2015 and the second " Jinder" which came out in 2017. Akhtar Salimi presents the water-powered jinder as a symbol of the thousand-year-old civilization of the Hazara villages of "Kikot". The word Jinder refers to a water mill. This article presents a thematic study of the novel "Gender".

**Keywords:** Akhtar Raza Salimi, novels, poet, "Jage Hain Khabam Mein",“ Jinder”, Hazara village,"Kikot", thematic study

ناول زندگی کے مسائل کی نشاندہی کرتا ہے۔ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے نفسیاتی، فلسفیانہ، تاریخی، ماورائی، سائنسی، رومانوی، جاسوسی یا محض سماجی ہو سکتا ہے۔ناول کا موضوع جتنا آفاقی ہو گا، وہ جتنا اپنے زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور سماجی حقائق سے مربوط ہو گا، اتنا ہی وہ ایک زندہ فن پارے کی حیثیت سے دیکھا جائے گا۔ کہانی ناول کی بنیاد ہے۔اس کے ساتھ عصری رجحانات، سماجی حقائق اور زندگی کے جیتے جاگتے مسائل اور معاملات کے ساتھ ناول کی گہری وابستگی اسے داستان سے جدا کرتی ہے۔ محمد احسن فاروقی لکھتے ہیں:

"قصے میں انتظار یا تجسس کی خلش خاص چیز ہے اور جتنی زیادہ انتظار کی خلش ہو گی اتنا ہی دلچسپ قصہ ہو گا۔"(۱)

اختر رضا سلیمی بحیثیت شاعر اپنی ایک پہچان رکھتے ہیں۔ انھوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ ناول، ادارت اور تنقید کے میدان میں بھی اپنا زورِ قلم صرف کیا ہے۔ شاعری میں اپنی پہچان بنانے کے باوجود وہ اس سے زیادہ مطمئن نہیں تھے۔ لہٰذا وہ نثر کی طرف متوجہ ہوئے اور اب تک ان کے دو ناول شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا "جاگے ہیں خواب میں" جو کہ ۲۰۱۵ء کو چھپا اور دوسرا جندر جو کہ ۲۰۱۷ء کو منظر عام پر آیا۔ اور اس ناول کو یو۔ بی۔ ایل ایوارڈ (فکشن) سے بھی نوازا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ترکی حکومت نے اس ناول کو اپنے نصاب میں بھی شامل کر لیا ہے اور انقرہ یونیورسٹی میں بطور نصاب پڑھایا جا رہا ہے۔ آپ شاعری سے ناول کی طرف کس طرح آئے اس بارے میں لکھتے ہیں:

"میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ میں صرف ناول ہی میں اپنے آپ کو پوری طرح لکھ پایا ہوں اور میرا کیتھارسس جس طرح ناول لکھتے ہوئے ہوا، شاعری کرتے ہوئے نہیں ہو سکا تھا۔"(۲)

اختر رضا سلیمی ذات کے اندر رہنے والا مادی دنیا سے دور ایک ایسا تخلیق کار ہے جو اپنی تخلیق کے وجود کو خود پر یوں طاری کرتا ہے کہ دونوں کا فرق مٹ جاتا ہے۔ اور یوں دونوں کے ملاپ سے جو چیز سامنے آتی ہے اس کی ملکیت کے تمام حقوق اختر رضا سلیمی کو مل جاتے ہیں۔ اگر کوئی ان کو چھیننا چاہے یا نقل کرنا چاہے بھی تو ایسا کر نہیں پائے گا کیوں کہ تخلیق کے وجود کو اپنے وجود میں بھسم کر لینا کسی چور کے بس کی بات نہیں۔ محمود احمد قاضی ان کی اس خصوصیت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"اختر رضا سلیمی کے ناول میں ایک عمدہ ہنر یہ پوشیدہ ہے کہ وہ دور کی کوڑھی نہیں لاتا۔ وہ اپنے لوگوں اور اپنے وسیب کی بات کرتا ہے۔"(۳)

اختر سلیمی نے پانی سے چلنے والی جندر کو ہزارہ کے دیہات "کیکوٹ" کی ہزار سالہ تہذیب کی علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ لفظ جندر سے مراد پانی سے چلنے والی چکی ہے۔ جو اکا دکا اب بھی پہاڑی علاقوں میں نصب ہیں۔ یہ ناول ایک مٹتی تہذیب کا نوحہ ہے جس میں ایک جندروئی کی کہانی ہے۔ جو اپنے وجود کے ساتھ اس تہذیب کو بھی مرتا دیکھتا ہے۔ یہ کہانی اختر رضا سلیمی نے اپنے ہیرو واحد متکلم "ولی خان" کی زبانی ہم تک پہنچائی ہے جو جان بہ لب ہونے کے باوجود اپنے بیٹے، گاؤں والوں، دیگر رشتہ داروں اور دوستوں کو اپنی فوتگی سے ہونے والی تکالیف کا سوچ کر پریشان ہے۔ ولی خان جس نے اپنے باپ دادا کی میراث اس جندر کو کبھی بے چونگ چلتے نہ دیکھا، نہ سنا، اب ان پاٹوں کا بے مقصد گھومنا ایک گونج کی طرح اس کی روح کو گھائل کر رہا ہے۔ وہ کئی دنوں سے سو نہیں سکا اور نہ ہی کچھ کھایا پیا ہے۔ اس کا اور اس کے جندر کا کئی روز سے صرف پانی پر گزارہ ہے۔ پتھر رگڑ کھا کھا کر گھس رہا ہے اور اس کی بدبو ولی خان کو بے چین کر رہی ہے مگر وہ کر بھی کیا سکتا ہے؟ کیونکہ وہ اپنی زندگی کی آخری چونگ پیس چکا ہے۔ مصنف نے اس مٹتی تہذیب کو دوبارہ امر کر دیا ہے۔ کیوں کہ جو قاری اس سے پہلے جندر سے ناواقف تھے ان کو اس کے متعلق جاننے کو ملا۔ اس حوالے سے شاہد احمد نواز لکھتے ہیں:

"جندر 'المیاتی رنگ اور کیفیت میں ڈوبا ہوا ایسا ناول ہے جس میں مٹتی ہوئی مقامیت کو دل آویز بنا کر پیش کیا ہے۔۔۔۔۔ جندروئی دراصل اس مقامیت کی آخری نشانیوں میں سے

ایک ہے، جو مٹنے کے قریب ہے۔ اس ناول نے اس مٹتی مقامیت کو نہایت دل آویز شکل میں محفوظ کر لیا ہے۔"(۴)

انسان جیسے جیسے ترقی کرتا ہوا ٹیکنالوجی کی طرف سفر کرتا ہے تو اپنی گزشتہ تہذیبوں کو بس تصویری صورت میں محفوظ کر لیتا ہے۔ جیسے گزرے وقتوں میں مواصلاتی نظام خط و کتابت کا تھا مگر رفتہ رفتہ ان کی جگہ موبائل فون اور انٹرنیٹ نے لے لی۔ اگر دیکھا جائے تو کسی تہذیب کے معدوم ہونے سے سب سے زیادہ متاثر وہ لوگ ہوتے ہیں جو پیشہ ورانہ اس تہذیب سے منسلک ہوتے ہیں اور ان کے لیے نئی تہذیب ان کی موت کے برعکس ہوتی ہے۔ یہی چیز ہمیں اس ناول میں دکھائی دیتی ہے۔ ولی خان جو کہ اس ناول کا ہیرو ہے، نئی تہذیب اس کے لیے موت کا سبب بن جاتی ہے۔ اس ناول کا پھیلاؤ جندر کے دائرے جتنا ہی ہے مگر اس میں کردار، فکشن اور بالخصوص منظر کشی بہت عمدہ کی ہے اور پڑھتے سمے جندر آپ کے سامنے گھومتا نظر آتا ہے۔ اس میں کہانی کی گرفت بہت مضبوط ہے جو قاری کو پہلی سطر سے ہی اپنے ساتھ بہائے چلی جاتی ہے اور اختتام ایک آبشار کی مانند ہوتا ہے۔ ناول میں موت کے فلسفہ کو بہت عمدہ طریقے سے بیان کیا گیا ہے کہ یہ زندگی کے ساتھ کسی جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ یہ عام سادہ زبان میں بیان کی گئی داستان طرز کی کہانی ہے مگر اپنے اندر بہت سے پوشیدہ راز لیے خلیفۂ خدا کے معاشرتی برتاؤ کی پرتیں کھول رہی ہے۔

انسان جندر کے پاٹوں کے درمیان گھن کی طرح تاعمر پستا رہتا ہے۔ کبھی باپ دادا کی کہانیاں، ان کے کارنامے سینہ تان کر سناتا ہے تو کبھی پرنم آنکھوں سے سر جھکا کر شرمسار دل گرفتہ اپنے خمیر میں بسے عیوب کی وجہ سے بیوی، بیٹے اور معاشرے کے دیگر افراد کو باوجود کوشش اور چاہنے کے ان کا حق نہ دے سکنے کی کہانی بیان کرتا ہے۔ جہاں یہ ناول زندگی کے دیگر مسائل کی طرف اشارہ کرتا ہے وہیں محسوس ہوتا ہے یہ کہانی نسلوں کے درمیان بڑھتے فاصلوں کی کہانی بھی ہے، جسے ماڈرن دنیا، "جنریشن گیپ" کا نام دیتی ہے۔ باپ ساری زندگی خود کو مار کر جس اولاد کو جوان اور عزت کی روٹی کمانے کے لائق بناتا ہے پھر وہی اس کے بوسیدہ کپڑوں، تعلیمی قابلیت، پرانی سوچوں اور پرانے اسلاف کی نشانیوں سے جڑے رہنے کی بدولت باعثِ توہین سمجھ کر اپنے تئیں اس کا بہتر حل نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ نادان یہ نہیں سمجھ پاتا کہ انسان انسانوں کے بغیر اگر نہیں رہ سکتا تو اپنے اردگرد پھیلے قدرتی نظاروں، جھیلوں، دریاؤں، چشموں اور پہاڑوں کے بغیر کیسے جی سکتا ہے۔

اس جندر کے دو پاٹ ہم ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ چلتے چلتے زندگی گزار دیتے ہیں مگر ایک دوسرے کے سینے سے لگنے سے گھبراتے ہیں کہ کہیں ایک دوسرے کو گھسا نہ دیں۔ کہیں ایک دوسرے کو نیست و نابود نہ کر دیں۔ ہماری رگڑ سے اٹھا دھواں کائنات میں پھیل کر سورج کی روشنی کو دیگر جانداروں سے چھپا نہ لے۔ آپس کی ہوس، لالچ اور منافقت کی بدبو سے ہم دیگر سانس لیتی چیزوں کا دم نہ گھونٹ دیں۔ اختر رضا سلیمی نے اس کرب کو محسوس کیا پھر اسے الفاظ و جذبات کی ایسی خوبصورت پوشاک پہنائی جو ہر قاری کو نہ صرف بھا رہی ہے بلکہ وہ اس پوشاک کے دامن میں اپنے سب غم، سب مشکلات ڈال کر مرنے سے قبل ایک پرسکون نیند لینا چاہتا ہے۔ ہم میں سے کتنے ہی لوگوں نے زندگی میں کبھی نہ کبھی یہ محسوس کیا ہو گا کہ انسان کی زندگی پر آوازوں کا کتنا اثر ہوتا ہے۔ مگر شاید ہی کوئی اس جذبے کو صفحہ قرطاس پر اس خوبصورتی کے ساتھ بکھیر پایا ہو جیسا کہ اختر رضا سلیمی نے کیا ہے۔ اس آرٹیکل میں ناول "جندر" کا موضوعاتی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

**توہم پرستی**

جس چیز کا حقیقت میں کوئی وجود نہ ہو اس کا وجود، یا جس چیز میں خاص تاثیر نہ ہو اس میں خاص تاثیر کا اعتقاد رکھنا توہم پرستی کہلاتا ہے۔ بالفاظ دیگر توہم پرستی کا مطلب خود یا جہالت کی وجہ سے غیر عقلی عقائد پر یقین رکھنا ہے جیسا کہ عوام الناس میں پتھروں اور ستاروں کے موثر ہونے کا اعتقاد مشہور ہے۔ اسی کو توہم پرستی کہتے ہیں۔ اسی طرح کی توہم پرستی کے عناصر ہمیں ناول "جندر" میں بھی نظر آتے ہیں۔ یہ اقتباس دیکھئے

> "بجو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کائنات کی واحد مخلوق ہے جس کو انسانی ٹخنوں میں دھڑکتی اس رگ کا پتا ہوتا ہے جسے پکڑنے سے مردہ اٹھ کر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ جمال دین کے بقول اگر مردے کو دفنانے کے بعد قبر پر کانٹے دار پھنگیں نہ رکھی جائیں تو آدھی رات کے وقت بجو انسانی لاش کی بو پا کر قبرستان میں داخل ہوتا ہے اور اپنے پنجوں سے قبر کھود کر اس میں اتر جاتا ہے۔۔۔ پھر مردے کو اپنے ساتھ چلا کر اپنے بل میں لے جاتا ہے اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اگلے تین چار دنوں میں چٹ کر جاتا ہے۔"(۵)

ولی خان جو کہ اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اپنی موت کے بارے میں سوچ وبچار کرتا ہے اور اس کو اپنے صحن میں سب سے پہلے آنے والے آدمی کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ جب میں مر جاؤں گا تو میری لاش کی خبر اگر کسی کو نہ ہوئی تو اس کو کیڑے مکوڑے کھا جائیں گے۔ بجو ایک جانور ہے۔ بلی سے چھوٹا ہوتا ہے۔ یہ عموماً قبرستان میں ہوتا ہے اور مردوں کو قبر سے نکال کر کھا جاتا ہے۔ یہ بڑا سخت جان اور مضبوط ہوتا ہے اگر ہاتھی کے پاؤں کے نیچے بھی آجائے تو نہیں مرتا۔ ولی خان کہتا ہے کہ اگر میں اس کہانی کی صداقت پر یقین رکھوں تو پھر مجھے اپنی موت کے بعد اپنے گھر میں آنے والے آدمی کے بارے میں کسی قسم کا تجسس نہ ہوتا۔ جب میری موت واقع ہو جاتی پھر بجو میری لاش کی بو سونگھ کر ادھر ہی آجاتے اور مجھے کھا جاتے۔ پھر کسی کو کسی قسم کی تگ ودو نہ کرنا پڑتی۔

دین اسلام میں توہمات کو سختی سے رد کیا گیا ہے۔ قبل از اسلام بھی لوگ توہم پرستی کا شکار ہوتے تھے۔ عرب معاشرے کے لوگ بیٹی کی پیدائش کو منحوس سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ جب حضور اکرم ﷺ کے لختِ جگر حضرت ابراہیم کی وفات ہوئی تو اس دن سورج گرہن لگا ہوا تھا تو کچھ لوگوں نے وفات کی وجہ سورج گرہن کو سمجھا لیکن آپ ﷺ نے ایسا خیال کرنے سے منع کیا۔ اگر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ توہمات پر یقین رکھنا در حقیقت "تقدیر پر یقین" کا رد عمل ہے۔ کوئی دن، پتھر، بستر، چرند پرند یا ستارے وغیرہ انسان کے نفع ونقصان کے خالق نہیں ہو سکتے سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ترجمہ:

> "تجھے جو بھلائی پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور تجھے جو برائی پہنچے وہ تیرے نفس کی طرف سے (یعنی تیرے ہی شامت اعمال کے سبب) ہے۔"(۶)

ناول سے مثال ملاحظہ کیجیے:

> "جندر کے پچھواڑے واقع کاہو کا بوڑھا درخت جس پر بہت عرصے تک لوگ منتیں مانگنے آتے رہے ہیں اور اب بھی اس کی شاخوں سے بندھے بے شمار جھنڈے لہرا رہے ہیں۔"
>
> (۷)

درختوں پر دھاگے باندھنا اور جھنڈے لہرانا یہ بھی توہم پرستی کی ایک قسم ہے۔ یہ ناول چونکہ برصغیر کے معاشرے کی عکاسی کر رہا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب مسلمان زوال پذیر تھے اور بعض علاقوں میں سکھوں اور ہندوؤں کی حکومت تھی۔ جمال دین جو کہ ولی خان کے والد کا تایا ہے اور اس کے دادوں نے سکھوں کے راجہ کے ساتھ ایک شرط لگائی تو یہ درخت دونوں فریقین کے درمیان سنگ میل قرار پایا۔ آج بھی ہمارے معاشرے میں توہم پرستی ہے۔ اور اس نے تقریباً مسلمانوں اور ہندوؤں کے اکٹھے رہنے کی وجہ سے زیادہ زور پکڑا ہے۔ ہمارے معاشرے میں مختلف افراد میں مختلف چیزوں کے بارے میں مختلف توہمات و نظریات قائم ہیں اور ان کو حیاتِ انسانی میں بہت ہی زیادہ موثر سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ شریعت کی تعلیمات کے سراسر متصادم ہیں۔

**موت کا فلسفہ**

ہر مذہب نے اپنے اپنے رنگ میں مرنے کے بعد کی زندگی کا ذکر کیا ہے۔ جو کہ جزیات میں ایک دوسرے سے مختلف ہے لیکن بنیاد میں ایک جیسا ہی ہے۔ ان میں اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ موت کو بھی حیات کی طرح سے تخلیق کیا گیا ہے۔ گویا کہ موت خود ایک مخلوق ہے جس طرح حیات مخلوق ہے۔ موت زندگی سے اور زندگی موت سے برآمد ہو سکتی ہے۔ مزید یہ کہ موت زندگی میں بدل سکتی ہے اور وہی زندگی پھر موت میں بدل سکتی ہے اور وہی موت پھر زندگی میں بدل سکتی ہے اور زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھی باقی رہ سکتی ہے۔ سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ترجمہ:

> "تم خدا سے کیوں کر منکر ہو سکتے ہو جس حال میں کہ تم بے جان تھے تو اس نے تم کو جان بخشی پھر وہی تم کو مارتا ہے پھر وہی تم کو زندہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔"(۸)

اختر رضا سلیمی نے بھی اپنے ناول جندر میں موت کے فلسفہ کو بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں جوں ہی کسی وجود میں زندگی ترتیب پاتی ہے موت بھی اس میں پناہ حاصل کر لیتی ہے۔ خدا کے وجود سے انکار کرنے والے تو آج بھی اس دنیا میں بے شمار ہیں لیکن دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا باشعور انسان ہو جو موت کے وجود کا انکار کرے۔ موت پر سب کا یقین ہے:

> "لیکن میرے خیال میں موت کہیں باہر سے وارد نہیں ہوتی وہ زندگی کی سرشت میں شامل ہوتی ہے۔ جوں ہی کسی وجود میں زندگی ترتیب پاتی ہے۔ موت بھی اس میں پناہ حاصل کر لیتی ہے اور زندگی کو اس کے وجود سے باہر دھکیلنے کا عمل شروع کر دیتی ہے۔ جس وجود کی زندگی جتنی طاقت ور ہوتی ہے وہ اتنے ہی طویل عرصے تک وہاں قدم جمائے رکھتی ہے۔"(۹)

اس دنیا میں ہر انسان کو موت آتی ہے۔ ہر باشعور انسان کو موت کا بھی اتنا ہی یقین ہوتا ہے جتنا زندگی کا۔ جوں ہی کوئی انسان اس دنیا میں آتا ہے اور پہلا سانس لیتا ہے تو اس کا پہلا سانس موت کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

ترجمہ:

> "ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔"(۱۰)

بزرگ کہتے ہیں کہ جب آدمی مرنے کے قریب ہوتا ہے تو اس کے خفیہ حواس جن کو وہ ساری زندگی کام میں نہیں لاتا موت کی آہٹ سے جاگ اٹھتے ہیں اور اسے اپنی موت کے حوالے سے پہلے خبر ہو جاتی ہے اور موت کے حوالے سے اس کو خواب بھی آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے موت کے فلسفے کو بڑے احسن انداز میں بیان کیا ہے۔ ولی خان جو کہ ان کے ناول کا ہیرو ہے وہ بھی جب موت کے قریب ہوتا ہے تو پینتالیس دن پہلے وہ اپنی ماں اور موت دونوں کا ہاتھ اپنے شانوں پر محسوس کرتا ہے لیکن وہ اپنی موت کے بارے میں اتنا نہیں سوچتا۔ جتنا کہ اس آدمی کے بارے میں سوچتا ہے کہ اس کی موت کے بعد جندر پر آنے والا پہلا شخص کون ہو گا؟ جس طرح اختر رضا سلیمی نے موت کے فلسفے کو بیان کیا شاید ہی کوئی ایسا ناول نگار ہو جو موت کے فلسفے کو اس جیسا بیان کرے۔ ایسا ناول نگار صدیوں بعد پیدا ہو گا اگر ہو گا بھی تو اختر رضا سلیمی کے موت کے فلسفے سے ضرور استفادہ کرے گا۔

### باپ کی لازوال محبت

ایک باپ ہی ہے جو اپنی اولاد کے لیے اپنی ذات سے غافل ہو کر اپنی ہر ضرورت بھول کر اولاد کی ہر خواہش اور فرمائش پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر باپ کا بس چلے تو بچوں کی زندگی میں آنے والے غم اور مشکلات اور محرومیوں کو سمیٹ کر سمندر میں بہادے۔ اختر رضا سلیمی کے ناول جندر میں بھی ہمیں باپ کی اپنے بیٹے سے محبت کا جذبہ نظر آتا ہے۔ ولی خان کا باپ جس کا ناول میں نام نہیں بتایا گیا، اپنے بیٹے سے بہت محبت کرتا ہے۔ جب ولی خان کی والدہ یعنی ولی خان کے باپ کی بیوی کا انتقال ہوتا ہے تو دوسری شادی نہیں کرتا۔ حالانکہ اس وقت وہ جوان ہوتا ہے لیکن پھر بھی شادی نہیں کرتا صرف اس وجہ سے کہ جب وہ دوسری شادی کرے گا تو اس کی بیوی ولی خان سے سوتیلی ماں جیسا سلوک نہ کرے:

> "ویسے بھی میں کیا کرتا ہوں کیا سوچتا ہوں، اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی بس وہ مجھے ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں اس سے کہہ دیتا کہ میرا سکول جانے کو جی نہیں چاہتا تو وہ اپنی لاشعوری خواہش کے برعکس، محض میری خوشی کا خیال رکھتے ہوئے مجھے سکول سے ہٹا دیتا۔ جب میری ماں مری تو وہ بالکل جوان تھا لیکن اس نے دوسری شادی نہیں کی۔۔۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی دوسری بیوی میرے ساتھ سوتیلی ماؤں والا سلوک کرے۔"(۱۱)

اس ناول میں اختر رضا سلیمی نے باپ کی بیٹے سے محبت جیسے جذبے کو بھی موضوع بنایا ہے اور بتایا ہے کہ ایک باپ اپنے بیٹے کے لیے کیا کیا نہیں کرتا اور ایک باپ اپنے بیٹے کے لیے بڑی سی قربانی دینے کے لیے بھی پیچھے نہیں ہٹتا۔ اپنے سکون کو اپنے بیٹے پر قربان کر دیتا ہے۔ بچے کے لیے دنیا میں باپ کے ہونے کے احساس سے زیادہ قیمتی شے اور کوئی نہیں۔

### کتب بینی کا شوق

کتابیں انسان کو انسان بنانے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ کتابوں میں علم کا ایک ایسا بیش قیمت خزانہ پنہاں ہوتا ہے جو کسی بھی عام انسان کو عالم بن جانے کے قابل بنا دیتا ہے۔ ایسی لاجواب کتابیں موجود ہیں جن کو لکھنے کے لیے ان کے مصنفین نے اپنی زندگیاں صرف کر دیں۔ یہی کتاب دوستی اور کتاب سے محبت ہمیں اختر رضا سلیمی کے ناول "جندر" میں بھی نظر آتی ہے۔ ولی خان اور جمال دین جو کہ ولی خان کے والد کا تایا ہے، دونوں کو کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق ہوتا ہے۔ دونوں بہت کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کو کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ ولی خان کو کتاب پڑھنے کا شوق بابا جمال دین سے لگا اور اس شوق کو مزید نکھارنے

میں اس کی بیوی ہاجرہ کا خاصا کردار رہا۔ ہاجرہ ولی خان اور جمال دین سے زیادہ پڑھی لکھی تھی اس لیے وہ کتاب کے مقصد کو اچھی طرح سمجھتی تھی اور کتاب کو پڑھنے کے بعد اس پر بہت اچھے طریقے سے تجزیہ کر لیتی تھی۔ اس مثال کے ذریعے اس کو واضح کرتے ہیں:

> "کچھ ہی عرصے میں ہم تینوں نے مل کر اردو کا تمام نثری ادب چھان مارا اور پھر عالمی ادب جن میں ناولوں اور کہانیوں کے اردو یا فارسی تراجم اس دور میں دستیاب تھے تلاش کرنا شروع کر دیے۔ بابا جمال دین فارسی نہیں جانتا تھا اس لیے فارسی کتاب کے مطالعہ کے لیے ہم دونوں میں سے کوئی ایک پڑھتا اور دوسرا ساتھ ساتھ اس کا ترجمہ کرتا جاتا۔ ہمارے قصبے میں کتابوں کی ایک دکان تھی اس کے پاس ہمارے دلچسپی کی کتابیں ایک حد تک دستیاب تھیں لیکن ان کے تراجم نہ ہونے کے برابر تھے۔ شروع میں کتابیں خریدنے مجھے خود پنڈی جانا پڑتا۔۔۔ یوں اس دور میں ہم نے تقریباً ہر اس زبان کا افسانوی ادب پڑھا جو اردو یا فارسی میں دستیاب تھا۔"(۱۲)

ایک اور مثال سے اس کو مزید نکھارتے ہیں۔

> "میں اپنے ذاتی اخراجات نکال کر باقی پیسوں کی کتابیں خرید لاتا اور فارغ اوقات میں ان کے مطالعے میں غرق رہتا۔"(۱۳)

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ ولی خان، جمال دین اور ہاجرہ کو کتابیں پڑنے کا کتنا شوق تھا۔ سب سے زیادہ شوق ولی خان کو تھا اور کتابوں سے محبت بھی کرتا تھا۔ ولی خان کو کتابوں سے اتنی محبت تھی کہ وہ اپنے ذاتی اخراجات میں سے کتابیں خرید کر لاتا تھا اور بعد میں ان کتابوں کو محفوظ کرنے کے لیے باقاعدہ کمرہ بھی تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ اس ناول کے ذریعے اختر رضا سلیمی ہمیں کتابیں پڑھنے کی طرف راغب کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ ہم کتابیں پڑھیں اور اس سے ہمارے علم میں مزید اضافہ ہو اور ترقی کی منزلیں طے کرتے چلیں۔

**لالچ**

کسی چیز میں حد درجہ دلچسپی کی وجہ سے نفس کا اس کی جانب راغب ہونا طمع یعنی لالچ کہلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

ترجمہ:

> "اور جو اپنے نفس کے لالچ سے بچایا گیا تو وہی کامیاب ہیں۔"(۱۴)

لالچ بہت بری خصلت اور نہایت خراب عادت ہے۔ لالچ انسان کو بے شمار مصائب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ کیونکہ لالچی شخص کسی مقام پر مطمئن نہیں ہوتا۔ لالچ بے شمار گناہوں کا سرچشمہ ہے۔ لالچ اور چاہت میں فرق ہوتا ہے۔ اختر رضا سلیمی کے ناول "جندر" میں بھی ہمیں لالچ جیسا عنصر دکھائی دیتا ہے۔ ولی خان جو کہ اختر رضا سلیمی کے ناول جندر کا ہیرو ہے۔ اس کے کردار میں ہمیں لالچ جیسی خامی ملتی ہے۔ وہ اپنے خواہش کی تکمیل کے لیے لالچ کا دامن تھامتا ہے اور اپنا ضمیر مردہ کرتا ہے۔ ولی خان نے ایک کمرہ تعمیر کرنا ہوتا ہے لیکن ولی خان کے پاس اتنے وسائل نہیں ہوتے کہ وہ کمرہ تعمیر کر سکے۔ پھر وہ اپنی زندگی میں لالچ جیسی بُری خصلت کو داخل کر لیتا ہے:

"ہر آنے والا مجھ سے درخواست یا تقاضا کرتا کہ میں اسے ابھی اور اسی وقت پیس دوں۔ اور جب میں اسے اپنی باری کا انتظار کرنے کو کہتا تو وہ مجھے پانچ سیر فی من پسوائی کی پیش کش کرتا۔ پہلے تو کئی دن تک میں ان لوگوں کی پیش کش کو رد کرتا رہا، لیکن ایک روز جب میں جندر میں لیٹا، پسار کو کمرے میں تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا تو مجھے خیال آیا، اگر میں ان دور سے آنے والوں کی پیش کش کو قبول کرلوں تو خشک سالی کے اختتام تک اتنے پیسے ضرور جمع کرلوں گا کہ اپنی اس خواہش کی تکمیل کر سکوں چنانچہ زیادہ منافع کے پیش نظر میں قریبی گاؤں کے لوگوں کو ہفتے ہفتے بعد کا وقت دینے لگا اور دور سے آنے والوں سے بھاؤ تاؤ کر کے انھیں چونگیں پیس کر دینے لگا۔"(۱۵)

انسان جب اپنی خواہشات کو زندگی پر حاوی کرلے تو پھر وہ لالچ و طمع جیسی بُرائیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کو صرف اپنے فائدے کی تکمیل ضروری ہوتی ہے۔ دوسروں کے نفع و نقصان کو نہیں دیکھتا۔ اختر رضا سلیمی نے ولی خان کے کردار کے ذریعے لالچ جیسی بُری خصلت اور برائی کو اجاگر کیا ہے۔ لالچ ایک خطرناک چیز ہے۔ اس کی تصدیق شریعت کی تعلیمات سے بھی ہوتی ہے۔ اس حوالے سے روایات کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے جو اس بڑے خطرے کو تفصیل سے بیان کرتا ہے۔

**اتفاق**

ایک دوسرے سے مل جل کر رہنا اور ایک رائے قائم کرنا اتفاق کہلاتا ہے۔ اتفاق کے بغیر کسی مقصد کا حاصل ہونا ناممکن ہے۔ انسان نے جب بھی ترقی کی ہے وہ اتفاق اور اتحاد کی قوتوں سے حاصل کی ہے۔ اختر رضا سلیمی کے ناول جندر میں بھی ہمیں اتفاق اور مل جل کر کام کرنے کی خوبی نظر آتی ہے۔ اس ناول میں زیادہ تر گاؤں کے ماحول کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ گاؤں میں اکثر لوگ اپنا کام مل جل کر کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ ناول میں دکھایا گیا ہے کہ جب لوگ اپنے مکانوں کی تعمیر کرتے تھے تو گاؤں کے دوسرے لوگ ان کی مدد کرنے کو آتے تھے اور بلا معاوضہ کام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ جب کھیتی باڑی کرنی ہوتی، کوئی فصل تیار ہو جاتی تو سب لوگ مل کر ایک دوسرے کی فصل کی کٹائی کرتے۔ مرد باہر کام کرتے تھے اور عورتیں گھر میں مل کر سب کام کرتیں تھیں۔ اور سب ایک دوسرے کے ساتھ محبت سے رہتے تھے:

"فصلوں؛ خاص کر گندم کی کٹائی اور گاہی کے دنوں میں وہ لوگ بھی جو شہر میں نوکری یا کاروبار کر رہے ہوتے، راتوں رات گاؤں آجاتے اور صبح سویرے درانتیاں اٹھائے لیتریوں میں شمولیت کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔ سب مل جل کر ایک دوسرے کی فصلیں کاٹتے۔۔۔ مکئی کی کٹائی کے بعد گاؤں کی عورتیں مل کر اسے چھیلتیں اور پھر مرد، راتوں کو بھاری سوٹے لے کر اسے کوٹتے اور ان کے دانے علاحدہ کرتے۔"(۱۶)

ایک اور ملاحظہ فرمائیں:

"ان دنوں گھروں کی تعمیر میں بھی لوگ رضاکارانہ طور پر حصہ لیتے۔ جب کوئی شخص نیا مکان بنانے کا منصوبہ بناتا، گاؤں کے بیشتر لوگ اس میں بلا معاوضہ ہاتھ بٹانے آتے تھے۔ دیواروں کی چنائی کرنے والے مستری کے علاوہ کسی کو معاوضہ دینے کا رواج نہیں تھا۔"

(۱۷)

ان مثالوں سے ہمیں گاؤں کے لوگوں کی آپس میں محبت دکھائی دیتی ہے۔ گاؤں کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ لیکن اس خوبصورتی کو ٹیکنالوجی اور سائنس نے ختم کر دیا ہے۔ اب لوگ ایک گاؤں میں رہنے کے باوجود اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ کسی کا کوئی ہاتھ نہیں بٹاتا۔ رات کو سوتے ہیں تو صبح اٹھ کر دیکھتے ہیں کہ جو فصل رات کو کھڑی تھی صبح ہوتے ہی اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ کسی کو کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ شہر کی طرح گاؤں میں بھی لوگ اب اپنے اپنے کاموں میں مگن ہیں۔ اتفاق میں مضبوطی ہے۔ کسی بھی کام میں کامیابی حاصل کرنے کا واحد اور عمدہ طریقہ اتفاق اور مل جل کر کام کرنے میں ہے۔

**میاں بیوی کی محبت**

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلا رشتہ میاں بیوی کا بنایا اور سارے رشتے اس کے بعد وجود میں آتے گئے۔ اس سے اس رشتے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس رشتے کا ٹھیک ہونا اسی طرح درست ہے جس طرح کسی عالیشان عمارت کی بنیاد کا مضبوط ہونا ضروری ہے۔ جس طرح کسی بھی عمارت کی پائیداری کا انحصار اس کی بنیاد پر ہوتا ہے اسی طرح ایک پر امن اور خوبصورت معاشرے کے قیام کے لیے رشتہ ازدواج سے منسلک افراد کی محبت و اخلاص و وفاداری اور باہمی سمجھوتہ انتہائی ضروری ہے۔

اختر رضا سلیمی کے ناول میں بھی ہمیں میاں اور بیوی کے درمیان محبت جیسا پہلو ملتا ہے۔ ولی خان کے والدین جن کا ناول میں کوئی نام نہیں دونوں محبت کی مثال ہوتے ہیں۔ ان دونوں کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تو ولی خان کی دادی ولی خان کے باپ کو دوسری شادی کرنے کا کہتی ہے۔ لیکن ولی خان کا باپ اس بات پر راضی نہیں ہوتا۔ اور دونوں کا رشتہ محبت کی بنیاد پر قائم رہتا ہے، اور شادی کے پانچ سال بعد ولی خان کی پیدائش ان کے ہاں ہوتی ہے۔ لیکن ولی خان کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کی والدہ کا انتقال ہو جاتا ہے اور وہ ولی خان کو ایک نظر دیکھ بھی نہیں پاتی۔ ولی خان کا باپ دوبارہ شادی نہیں کرتا حالانکہ وہ بالکل جوان تھا:

> "میں نے دل ہی دل میں دوسری شادی کا ارادہ باندھ لیا؛ اگرچہ میں نے ابھی رضامندی کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن تمھاری ماں جو میرے دل میں پیدا ہونے والے خیالات سے بھی آگاہ ہو جایا کرتی تھی۔ فوراً بھانپ گئی اور اس کا چہرہ یک دم اتر گیا۔ میں نے ایک نظر اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور اگلے ہی لمحے انکار کا فیصلہ کر لیا۔"(۱۸)

دوسری مثال ملاحظہ ہو:

> "یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بادل نخواستہ ہی مجھے دوسری شادی کی اجازت دے رہی ہے۔ لمحہ بھر کے لیے اس لڑکی کا چہرہ میرے ذہن میں لہرایا تھا۔ اس لڑکی کے چہرے کو ذہن میں تصور کر کے میں نے دوبارہ تمھاری ماں کی آنکھوں میں جھانکا تو مجھے لگا کہ جیسے وہ میرے ذہن میں موجود اس لڑکی کی تصویر کو دیکھ رہی ہے بلکہ اگر میں نے اسے مزید کچھ دیر کے لیے اپنے ذہن میں ٹھہرائے رکھا تو تمھاری ماں مر جائے گی۔"(۱۹)

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان کتنی محبت تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے دل میں پیدا ہونے والے خیالات کو بھی بھانپ لیتے تھے۔ اگر میاں بیوی کے رشتے میں الفت و چاہت کا عنصر نہ ہو تو گھر جہنم کا نظارہ پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ خاندانوں کی بقا خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اولاد کا مستقبل تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

**غربت**

اختر رضا سلیمی کے ناول میں بھی ہمیں غربت جیسا فکری پہلو ملتا ہے۔ اختر رضا سلیمی کا ناول جندر چونکہ ۱۸۴۰ء کے زمانہ کی عکاسی کرتا ہے۔ لہٰذا غربت اس وقت عام تھی اور ہر دوسرے گھر میں غربت اپنے پاؤں جمائے ہوئے تھی۔ کہیں کہیں دن تک لوگ بھوکے رہتے تھے اور بعض اوقات ان کو ابلے ہوئے دانوں پر گزارہ کرنا پڑتا تھا۔ اس وقت چونکہ کھیتی باڑی کا انحصار زیادہ تر بارشوں پر ہوتا تھا۔ اگر بارشیں ہو جاتیں تو اتنا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اگر بارشیں نہ ہوتیں یا بے وقت ہوتیں تو یہ غربت میں اضافے کا باعث بنتیں۔ ولی خان کے پاس ایک شخص بہت دور سے دانے پسوانے آتا ہے اور ولی خان سے درخواست کرتا ہے کہ میرے دانے پیس دو اور مجھ سے آٹے کی پسوائی زیادہ لے لو۔ مثال ملاحظہ ہو:

> "خشک سالی کی وجہ سے میرے علاقے کی ندیاں خشک ہو گئی ہیں۔ میرے بچے بھوکے ہیں انھیں کئی دن سے روٹی نصیب نہیں ہوئی اور وہ ابلے ہوئے دانوں پر گزارا کر رہے ہیں۔ اپنے علاقے کی بدنصیبی کا رونا رونے کے بعد انھوں نے مجھ سے درخواست کی کہ اگر میں ان کے لائے ہوئے دانوں کا آٹے سے تبادلہ کر دوں تو ان کے بچے مجھے دعائیں دیں گے۔"(۲۰)

غربت آج بھی بہت بڑا مسئلہ ہے اور اس کو ختم کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ دوسرے ملکوں کی نسبت پاکستان زیادہ غربت کا شکار ہے۔ انسان کو بنیادی سہولیات بھی میسر نہیں ہیں۔ ملک میں صنعتی ترقی سے اور تعلیم میں اضافے سے غربت کو کافی حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔ تعلیم کو صنعتی اور ملکی ضروریات کے لحاظ سے شکل دینا چاہیے تاکہ جو تعلیم حاصل کر کے نکلیں وہ ملک کے لیے کار آمد ثابت ہو سکیں۔

**تعلیم نسواں**

اختر رضا سلیمی کے ناول جندر میں ہمیں تعلیم نسواں کے حوالے سے فکری پہلو نظر آتا ہے۔ یہ ناول چونکہ ایک گاؤں کی عکاسی کرتا ہے اور گاؤں میں تعلیم کا رجحان ویسے بھی کم ہوتا ہے۔ یہ ناول انیسویں صدی کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا اس وقت تعلیم کا رجحان تو ویسے بھی بہت کم تھا۔ عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ اس ناول میں ایک کردار ہاجرہ جو کہ اپنے پورے گاؤں کی پہلی بی۔ اے پاس لڑکی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور لڑکی پڑھی لکھی نہیں دکھائی گئی۔ ہاجرہ بھی صرف اسی وجہ سے تعلیم حاصل کر پاتی ہے کیونکہ اس کا باپ لڑکوں کے اسکول میں چپڑاسی ہوتا ہے۔ ہاجرہ نے پڑھنے کی ضد کی تو اس کے باپ نے جمال دین کے کہنے پر لڑکوں کے اسکول میں داخل کروا دیا، کیونکہ لڑکیوں کا سکول گاؤں سے سات میل کی دوری پر تھا۔ اس گاؤں کے لوگ اپنی بچیوں کو تعلیم دلواتے ہی نہیں تھے اور جو لوگ تھوڑے باشعور تھے وہ بھی صرف پرائمری تک تعلیم دلواتے تھے۔ اس کے بعد گھر کے کاموں میں لگا دیتے تھے۔ مثال ملاحظہ ہو:

> "وہ ہمارے گاؤں کی پہلی میٹرک پاس لڑکی تھی۔ ان دنوں ہمارے ہاں لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج ہی نہیں تھا، جو لوگ تھوڑے باشعور تھے وہ بھی بہ مشکل پرائمری تک ہی بچوں کو تعلیم دلواتے تھے۔"(۲۱)

اگر ہم دیکھیں تو یہ بات آج بھی ہمیں نظر آتی ہے۔ لڑکیوں کو آج بھی تعلیم سے محروم رکھا جاتا ہے۔ اس جدید دور میں بھی بعض علاقے ایسے ہیں جہاں پر عورتوں کو تعلیم نہیں دلوائی جاتی۔ ان پر تعلیم کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہوتے ہیں۔ جو کہ عورتوں کے ساتھ ظلم ہے۔ جس طرح ملک کا انتظام وزیر اعظم چلاتا ہے اور تمام امور کی نگرانی کرتا ہے اسی طرح ایک گھر کی سلطنت کو چلانے کی ذمہ دار بیوی ہوتی ہے۔ اگر بیوی سلیقہ مند، باشعور، پڑھی لکھی اور سمجھ دار ہو گی تو گھر کا انتظام بہت احسن طریقے سے کرے گی۔

**لیتری کی ثقافت**

لیتری ایک ثقافت بھی ہے اور بھائی چارہ و اخوت کی مثال بھی۔ مل جل کر کام کرنا کسی بھی معاشرے کی ترقی اور خوشحالی کا ضامن ہوتا ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں سماجی کاموں کو بلا معاوضہ کرنے کے لیے دنیا میں مختلف این۔جی۔اوز معرض وجود میں آچکی ہیں۔ یہ این۔جی۔اوز کسی بھی غریب ملک میں جہاں فلاحی کاموں کو بلا معاوضہ اور جذبہ خیر سگالی کے طور پر کام کرنے کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں وہیں یہ اس بات پر بھی زور دیتی ہیں کہ معاشرے میں مل جل کر کام کیا جائے۔ لیکن اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے اس بات کا درس دیا اور اجتماعیت کو فروغ دیا۔ پانچ وقت کی نماز باجماعت اور حج بیت اللہ کی عبادات میں اجتماعیت ہی نظر آتی ہے، تاکہ مسلمانوں میں باہمی جذبہ اور بھائی چارے کو فروغ ملے۔ مل جل کر کام کرنے سے ایک دوسرے میں جہاں رابطہ اور تعلق قائم ہوتا ہے وہیں اس سے کسی بھی معاشرے میں کچھ مشترکہ اخلاقی اقدار بھی جنم لیتی ہیں۔

لیتری ہمارے معاشرے کی مشترکہ اخلاقی اقدار و ثقافت کی ایک مثال ہے۔ اگست کے اواخر میں کشمیر میں گھاس کی کٹائی کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔ لوگ گھاس کاٹ کر اس کو خشک کر کے محفوظ کر لیتے ہیں اور سردیوں میں جب پوری وادی برف کی سفید چادر اوڑھ لیتی ہے تو مویشیوں کے چارے کے طور پر یہی گھاس کام آتی ہے۔ گاؤں میں بعض کاموں کو انفرادی طور پر کرنا جب ایک آدمی کے لیے تھوڑا مشکل ہوتا ہے تو وہ کام سب مل کر کرتے ہیں جس کو لیتری کہتے ہیں۔ لیتری کی خاص بات یہ ہے کہ یہ بغیر کسی معاوضے کے رضاکارانہ طور پر کی جاتی ہے۔ لیتری کی ثقافت معاشرے میں آپس کے پیار و محبت کی اور بھائی چارے کی اہم مثال ہے۔

اختر رضا سلیمی کے ناول جندر میں بھی ہمیں لیتری کی ثقافت نظر آتی ہے۔ یہ ناول ایک گاؤں اور خاص طور پر ہزارہ کے علاقے کی ثقافت کی عکاسی کرتا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں محبت اور بھائی چارے کی خصوصیات تھیں۔ ان لوگوں کو جب بھی کوئی کام کرنا ہوتا تو وہ سب اکٹھے ہو جاتے اور مل کر اس کام کو کرتے۔ اگر فصل کی کٹائی کرنی ہوتی تو وہ بھی مل کر کرتے اور اگر کسی نے کوئی مکان تعمیر کرنا ہوتا تو لوگ اس کی مدد کو پہنچ جاتے اور بغیر کسی معاوضے کے کام کرتے۔ جو کہ وہاں کے لوگوں کی بہت ہی خوبصورت عادت تھی۔ مثال ملاحظہ ہو:

> "ان دنوں لیتریوں کے بغیر گاؤں کی زندگی کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ گاؤں کی تمام فصلوں اور گھاس وغیرہ کی کٹائی اور گاہی لیتری کی صورت میں مشترکہ طور پر ہوتی تھی۔۔۔ کٹائی کا موسم شروع ہوتے ہی گاؤں کے وہ لوگ بھی جو نوکری پیشہ ہوتے یا کاروبار اور محنت مزدوری کرنے شہر گئے ہوتے؛ گاؤں پلٹ آتے اور لیتری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔"(۲۲)

لیتری آپس میں بھائی چارے کی بہت ہی خوبصورت مثال ہے۔ ہزارہ کے رہنے والوں میں یہ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اگر کوئی نماز چھوڑ دیتا تو اس سے نہیں پوچھا جاتا تھا کہ تم نے نماز کیوں نہیں پڑھی لیکن اگر کوئی لیتری میں شرکت نہ کرتا تو اس

سے لازمی پوچھتے اور غائب ہونے کی وجہ دریافت کی جاتی تھی۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے ہاں لیتری نماز سے زیادہ اہم تھی اور وہ دینی کاموں پر لیتری کو ترجیح دیتے تھے۔ آج کے دور میں جہاں ہر طرف نفسا نفسی ہے۔ حسد، بغض اور نفرت ہے۔ اگر لیتری جیسی ثقافت دوبارہ بحال ہو جائے تو معاشرے کے لیے خوش آئندہ ہے۔ معاشرے میں پھر سے امن اور محبت قائم ہو سکتی ہے۔

**ماں بننے کا احساس**

اختر رضا سلیمی کے ناول جندر میں بھی ہمیں ماں بننے جیسا منظر نظر آتا ہے۔ ماں بننا ایک خوبصورت احساس ہے اور پھر ایک ایسی عورت کا ماں بننا جس کو کہیں سالوں سے اللہ تعالیٰ نے اس نعمت سے نہ نوازا ہو۔ اس کے لیے یہ احساس زندگی سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ ولی خان جو کہ جندر ناول کا مرکزی کردار ہے اس کے والدین کو پانچ سال تک کوئی اولاد نہ ہوئی۔ بیٹا اور بیٹی کی نعمت سے بالکل محروم تھے۔ پھر ولی خان کی دادی کی طرف سے بھی ولی خان کی والدہ کو طعنے سننا پڑتے تھے۔ اور اس کی ساس بار بار اپنے بیٹے سے اصرار کرتی رہی کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ لیکن وہ دوسری شادی نہیں کرتا۔ پانچ سال بعد اللہ تعالیٰ نے پھر ان کو ایک بیٹا عطا کیا۔ جس کا نام ولی خان رکھا گیا۔ لیکن بدقسمتی سے جیسے ہی ولی خان کی پیدائش ہوتی ہے اس کی ماں اس دنیا سے کنارہ کشی کر لیتی ہے۔ یعنی کہ ولی خان کی پہلی سانس اس کی ماں کی آخری سانس ثابت ہوئی۔ مثال ملاحظہ ہو:

> ''وہ آگیا ہے۔' ایک دن اس نے کھنکھناتی ہوئی آواز میں مجھے بتایا تھا۔ میں نے اس کی آواز میں خوشی کی کھنکھناہٹ تو محسوس کی تھی لیکن میں ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ پھر جب اس نے شرماتے ہوئے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا تھا تو مجھ پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔''(۲۳)

ولی خان کی والدہ کو ماں بننے کی اتنی خوشی تھی کہ وہ یہاں تک بتا دیتی ہے کہ اس کو بیٹا ہو گا یا بیٹی۔ اس کے علاوہ اپنے بیٹے کے خد و خال تک بتا دیتی ہے اور یہ بھی بتاتی ہے کہ میرے بچے کے چہرے پر تل ہو گا۔ وہ عورت جو اپنے بیٹے کے چہرے پر تل تک کا بتا دیتی ہے افسوس کہ وہ اپنی موت کے بارے میں نہ بتا سکی۔

**تنہائی**

بعض اوقات لوگ لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے سے گریز کرتے ہیں اور اپنے گرد تنہائی کا ایک خول چڑھا لیتے ہیں۔ طویل تنہائی اکثر نقصان دہ ہوتی ہے جس سے انسان ڈپریشن میں چلا جاتا ہے اور پھر ان کی شخصیت میں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ اختر رضا سلیمی کے ناول ''جندر'' میں ہمیں تنہائی پر مبنی موضوع بھی دکھائی دیتا ہے۔ تنہائی اس ناول کا سب سے اہم موضوع ہے۔ جب نئی تہذیب کا آغاز ہوتا ہے اور مشینی ہل چل شروع ہو جاتی ہے تو اس میں ولی خان پرانی تہذیب سے محبت کی وجہ سے اکیلا اور تنہا رہ جاتا ہے اور اتنا اکیلا اور تنہا ہو جاتا ہے کہ اس کی موت کے وقت بھی اس کے پاس کوئی نہیں ہوتا:

> ''جب تک جندر کے پچھواڑے میں موجود، معدوم ہوتے راستے پر سے گزرتے ہوئے، کسی شخص کو اچانک میرا خیال نہ آجائے اور وہ یوں ہی بغیر کسی پیشگی منصوبے کے محض میرا اتا پتا کرنے، جندر کے صحن کو اس اجاڑ راستے سے ملانے والے، سات قدمی زینے پر سے اترتا ہوا جندر کے دروازے تک نہ آجائے، یہ دروازہ جسے میں رات کو سونے سے پہلے ہمیشہ اندر سے کنڈی لگا دیا کرتا تھا؛ آج اسے بند کرتے ہوئے میں نے احتیاطاً کنڈی نہیں لگائی، کیوں

کہ میں جانتا ہوں کہ آج میری زندگی کی آخری رات ہے اور میرے بعد اسے کسی مانوس یا
ان جانی دستک پر، اندر سے کھولنے والا کوئی نہیں ہو گا۔ "(۲۴)

احساس تنہائی کا شکار آدمی اپنے جذبات و احساسات بیان نہیں کر سکتا۔ وہ دعوتوں اور محفلوں میں جانے سے گھبراتا ہے۔ وہ دوسروں سے ہم کلام ہونے سے کتراتا ہے۔ وہ ایک مخصوص اور تنگ دائرے میں مقید ہو کر رہ جاتا ہے۔ اختر رضا سلیمی نے بھی تنہائی جیسے حساس موضوع کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اختر رضا سلیمی کو تنہائی سے اتنا لگاؤ ہے کہ انھوں نے پورا ناول ہی تنہائی پر لکھ دیا ہے۔

"جندر" کا فکری جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس ناول کا مرکزی کردار ولی خان اپنی موت کو فقط اپنی نہیں بلکہ تہذیب کی موت اور جندر کی موت سمجھ رہا ہے۔ اس کا بچنا تو محال ہے لیکن اس کی دلی تمنا ہے کہ اگر پرانی روایات کا احیا ہو جائے تو یہ تہذیب ایک بار پھر سے جی اٹھے گی اور یہ جندر بھی، جو اس کے خاندان کی شجاعت و بہادری کی علامت اور نشانی ہے، پھر سے چل پڑے گا اور اس کے خاندان کا نام اور اس جندر سے وابستہ لوک روایت کو نئی زندگی مل جائے گی۔ وہ گہرے دکھ اور تاسف کا اظہار کرتا ہے کہ اب ایسا ہونا تقریباً ناممکن ہے کیوں کہ اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔

اختر رضا سلیمی کا ناول "جندر" اردو ناول کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کے ثمرات اور عالمی ناول کے تجربات و اثرات کو سمیٹتا ہوا ایسا ناول ہے جس میں اردو ناول کی مروج روایت کے مطابق نہ تو تاریخ کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے نہ ہی یہ ناول تقسیم اور اس کے اثرات کو زیر بحث لاتا ہے، نہ یہ کرداروں کی جنسی زندگی کا بیان ہے اور نہ ہی دہشت گردی اور 11/9 کے بعد سیاسی منظر نامے کے اثرات کا ماحصل ہے۔ نہ ہی یہ ناول پیچیدہ اسلوب کا حامل ہے اور نہ ہی علامت و تجرید کے زیر اثر لکھا گیا ناول ہے۔ تاہم ان میں سے بیشتر عناصر اس انداز سے ناول کے بیانیے کا حصہ بنائے گئے ہیں کہ ان کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ظاہری قرات میں ایسا محسوس ہوتا ہے۔ اُردو کا یہ پہلا ناول ہے جس میں انسانی وجود کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے۔ اختر رضا سلیمی کا یہ ناول "جندر" باقی سب ناولوں سے ہٹ کر ہے۔ امید ہے یہ ناول کئی صدیوں تک اردو ادب پر اپنی چھاپ بٹھائے رکھے گا اور اردو ادب میں آب حیات کی مانند نظر آتا رہے گا۔

## حوالہ جات


۱۔ محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر، ناول کیا ہے، کراچی: الکتاب، اگست، ۱۹۶۵ء، ص: ۲۲

۲۔ اختر رضا سلیمی، مشمولہ، خواب، اجتماعی لاشعور اور اختر رضا سلیمی، راولپنڈی: رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء، ص: ۱۳۲

۳۔ محمود احمد قاضی، معاصرین کی آرا، ایضاً، ص: ۱۴۶

۴۔ شاہد نواز، ڈاکٹر، اکیسویں صدی کے اردو ناول میں مقامیت کی دل آویز تشکیل، مشمولہ سہ ماہی ادبیات، اسلام آباد: شمارہ ۱۲۴، جنوری تا جون۔ ۲۰۲۰ء، مدیر اختر رضا سلیمی، اکادمی ادبیات پاکستان، اسالم آباد، ص: ۱۵۰۔۱۵۱

۵۔ اختر رضا سلیمی، جندر، راولپنڈی: رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص: ۱۹

۶۔ قرآن حکیم، سورۃ النساء، آیت: ۷۹

۷۔ اختر رضا سلیمی، جندر، راولپنڈی: رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص: ۳۷

۸۔ قرآن حکیم، سورۃ البقرہ، آیت: ۲۸

۹۔ اختر رضا سلیمی، جندر، راولپنڈی: رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص: ۱۰۶

۱۰۔ قرآن حکیم، سورۃ الانبیاء، آیت:۳۵

۱۱۔ اختر رضا سلیمی، جندر، راولپنڈی: رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص:۶۶

۱۲۔ ایضاً، ص:۴۶

۱۳۔ ایضاً، ص:۷۷

۱۴۔ قرآن حکیم، سورۃ الحشر، آیت:۹

۱۵۔ اختر رضا سلیمی، جندر، راولپنڈی: رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص:۸۰

۱۶۔ ایضاً، ص:۲۷

۱۷۔ ایضاً، ص:۱۰۰

۱۸۔ ایضاً، ص:۵۸

۱۹۔ ایضاً، ص:۵۹

۲۰۔ ایضاً، ص:۸۲

۲۱۔ ایضاً، ص:۸۶

۲۲۔ ایضاً، ص:۹۶

۲۳۔ ایضاً، ص:۶۰

۲۴۔ ایضاً


## References in Roman Script:


1. Muhammad Ahsan Farooqi, Dr., Novel kia hy, Karachi: Al-Katab, August, 1965, p. 22
2. Akhtar Raza Salimi, Mashmulah, Khuwab, Ijtamai Lashoor and Akhtar Raza Salimi, Rawalpindi: Rommel House of Publications, 2020, p: 132
3. Mahmood Ahmad Qazi, Muasreen ki Araa , Ibid , p: 146
4. Shahid Nawaz, Dr., In the 21st century Urdu novel main muqameet ki dilawaiz tashkeel, mashmoola ,sah mahi adbiat, Islamabad: Issue 124, January to June 2020, Director Akhtar Raza Salimi, Academy of Literature Pakistan, Islamabad, p: 150. 151
5. Akhtar Raza Salimi, Jinder, Rawalpindi: Rumel House of Publications, 2017, p: 19
6. Holy Quran, Surat al-Nisa, verse: 79
7. Akhtar Raza Salimi, Jinder, Rawalpindi: Rumel House of Publications, 2017, p: 37
8. Holy Quran, Surah Al-Baqarah, Verse: 28
9. Akhtar Raza Salimi, Jinder, Rawalpindi: Rumel House of Publications, 2017, p: 106
10. Holy Quran, Surah Al-Anbiya, verse: 35
11. Akhtar Raza Salimi, Jinder, Rawalpindi: Rumel House of Publications, 2017, p: 66
12. Ibid, P:46

**13.** Ibid,P:77

**14.** Holy Quran, Surah al-Hashr, verse: 9

**15.** Akhtar Raza Salimi, Jinder, Rawalpindi: Rumel House of Publications, 2017, p: 80

**16.** Ibid, P:27

**17.** Ibid, P:100

**18.** Ibid, P:58

**19.** Ibid, P:59

**20.** Ibid, P:82

**21.** Ibid, P:86

**22.** Ibid, P:96

**23.** Ibid, P:60

**24.** Ibid